لشکری زبان

زیف سید

ترتیب وڈیزائننگ فار اردو فینز

ایم پی خان

WWW.URDUFANZ.COM

فہرست

اردو زبان یا شہر 3
سنہرا کیمپ 6
چلتا پھرتا شہر 8
دلّی جو ایک شہر تھا 10
آیا نہیں ہے لفظ یہ ہندی زباں کے بیچ 12
کلام الملوک 16
دو نئے انداز 19
گیان و گماں کی سرحد 25
پہلی زبانیں، بگڑی زبانیں 28
چڑیا لائی چاول کا دانہ 30

WWW.URDUFANZ.COM

اردو زبان یا شہر

تیرہویں صدی عیسوی کے آغاز میں وسطی ایشیا کی چراگاہوں سے ایک ایسا طوفان اٹھا جس نے معلوم دنیا کی بنیادوں کو تہ وبالا کر کے رکھ دیا۔ چنگیز خان کی سفاک دانش کی رتھ پر سوار منگول موت اور تباہی کا پیغام ثابت ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے شہر کے بعد شہر، علاقے کے بعد علاقہ اور ملک کے بعد ملک سرنگوں ہوتے چلے گئے۔ محض چند عشروں کے اندر اندر خون کی ہولی کھیلتے، کھوپڑیوں کے مینار کھڑے کرتے، سنگین قلعوں اور عالی شان محلوں کی راکھ اڑاتے منگول بیجنگ سے ماسکو تک پھیلی دنیا کی تاریخ کی سب سے بڑی متصل سلطنت کے مالک بن گئے۔

اس سے پہلے کہ آپ سوچیں کہ اس سب قصے کا اردو سے کیا تعلق ہے، میں جلدی سے اضافہ کر دوں کہ یہی وہ اتھل پتھل تھی جس نے لفظ 'اردو' کو معلوم دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا دیا۔ اس سے پہلے کہ ہم اس بات کی تفصیل میں جائیں، پہلے کچھ لفظ 'اردو' کے اشتقاق کی بات ہو جائے۔

ہر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اردو ترکی زبان کا لفظ ہے اور اس کا مطلب لشکر ہے۔ اور اسے لشکر اس لیے کہا جاتا ہے کہ چوں کہ مغلوں کی افواج میں کئی زبانیں بولنے والے سپاہی تھے، ان کے اختلاط سے ایک نئی زبان وجود میں آ گئی۔ اس بات پر بحث آگے آئے گی لیکن پہلے میں ایک قیاس پیش کرتا چلوں کہ ہو سکتا ہے اردو ترکی کا نہیں بل کہ اصل میں سنسکرت زبان کا لفظ ہو!

اور وہ یوں کہ پرانی ترکی میں ایک لفظ پایا جاتا ہے، 'اُرتا'، جس کے معنی ہیں، مرکز۔ یہ لفظ بعد میں تبدیل ہو کر 'اوردُو' ہو گیا اور محل یا دارالحکومت کے معنی میں استعمال ہونے لگا) اس سے ملتا جلتا استعمال عربی لفظ 'صدر' کے ضمن میں سامنے آتا ہے۔ صدر ویسے تو چھاتی کو کہتے ہیں لیکن دیکھئے کہ پاکستان کے کئی شہروں کے مرکزی علاقے

WWW.URDUFANZ.COM

کو صدر کہا جاتا ہے۔مزید یہ کہ 'صدر مقام' دارالحکومت کو کہا جاتا ہے(۔ اب ملاحظہ ہو کہ سنسکرت کا لفظ 'ہردے' (دل)نہ صرف صوتی بلکہ معنہ یاتی اعتبار سے بھی ترکی 'اُرتا' اور 'اوردو' سے مشابہ ہے۔چوں کہ سنسکرت ترکی سے زیادہ قدیم زبان ہے، اس لیے ممکن ہے التائی کی چراگاہوں کے خانہ بدوشوں نے یہ لفظ سنسکرت سے اخذ کیا ہو۔ اگر قاری کے ذہن میں یہ سوال اٹھے کہ کہاں ہندوستان اور کہاں وسطی ایشیا کی چراگاہیں، تو عرض ہے کہ ترکی زبان کی تمام قبل از اسلام مذہبی تحریریں بدھ مت سے متعلق ہیں(ارکان ترکمان، 1987ء)۔اس پہ مستزاد، سنسکرت زبان کا ایک مادہ 'اُر' بھی ہے جس کا مطب بھی دل ہے(برج موہن کیفی،1966ء)۔

اب ہم لفظ اردو کی ترسیل کی طرف آتے ہیں۔ تحریری ترکی کی سب سے پرانی مثال منگولیا کی ایک لاٹھ پر کندہ ملتی ہے، جسے کُل تگین تحریر کہا جاتا ہے۔یہ یادگار 732ء میں اس نام کے ایک بادشاہ کی یاد میں اس کے بھائی نے تعمیر کرائی تھی۔ تحریر کا رسم الخط گوک ترک ہے اور اس میں کل چھیاسٹھ سطور ہیں۔

اس لاٹھ کی موضوعِ زیرِ بحث سے متعلق بات یہ ہے کہ اس میں الفاظ 'اورتو' اور 'اوردو' کئی بار آئے ہیں۔انٹر نیٹ پر اس لاٹھ کی زبان کی فرہنگ موجود ہے جس میں ان الفاظ کے معنی کچھ یوں دیے گئے ہیں:

اورتو: کاغان (مفرس شکل خاقان، یعنی بادشاہ) کی رہائش گاہ، دارالحکومت

اوردو: درمیان، مرکز

زمانہ کے اوراق تیزی سے پلٹ کر ہم ساڑھے تین صدیوں بعد یوسف خاص حاجب کی سیاسی جوڑ توڑ پر مبنی کتاب 'مقدس دانش' (1072ء) میں لفظ اردو کو دو مختلف معانی میں استعمال ہوتا دیکھتے ہیں:

WWW.URDUFANZ.COM

1 'ہر شہر، ملک، اور 'اردو' میں اس کتاب کا نام مختلف تھا(سلجوق یونیورسٹی، ترکی، کے ڈاکٹر ارکان ترکمان نے لکھا ہے کہ یہاں 'اردو' کا مطلب محل ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کا مطلب دار الحکومت بھی ہو سکتا ہے)۔

2(وہ) ایک الگ 'اُردو' کے رہنے والے تھے(شہر)

3 دنیا قید خانہ ہے، اس کی محبت میں مت گرفتار ہونا۔ بلکہ ایک بڑے 'اردو' اور ملک کی جستجو کرنا تاکہ چین سے رہ سکو(محل، شہر، دارالحکومت)

4 موت نے بڑے بڑے 'اُردو' اور ملک اجاڑ دیے(شہر)

شاید بہت سے لوگوں کے لیے 'مقدس دانش' میں اردو لفظ کا شہر کے معنی میں استعمال نیا ہو لیکن دل چسپ بات یہ ہے کہ ترکی میں 'اوردو' کے نام سے ایک صوبہ ہے اور سونے پہ سہاگہ یہ کہ اس صوبے کے دارالحکومت کا نام بھی 'اوردو' ہے۔ بحیرۂ روم کے ساحل پر سرسبز و شاداب جنگلوں سے گھرا ہوا یہ چھوٹا سا شہر قابلِ دید مقام ہے۔

لیکن یہ گمان نہ رہے کہ کسی شہر کے نام کی مندرجہ بالا مثال انوکھی ہے۔ اس نام کے کئی اور شہر بھی گزر چکے ہیں۔ پاکستان کی سرحد کے قریب واقع چینی شہر کاشغر کا منگول نام 'اردو قند' تھا۔ اسی طرح ایک اور شہر 'اردوبالہ یغ' کے نام سے تھا، جسے بعد میں قراقرم کہا جانے لگا(حافظ محمود شیرانی، 1929ء)۔

WWW.URDUFANZ.COM

سنہرا کیمپ

چوں کہ پہلے ہزاریے میں خانہ بہ دوش ترکوں اور منگولوں کے درمیان کافی ربط و اختلاط رہا ہے (جس کا اندازہ کل تگین لاٹھ کے منگولیا میں تعمیر کیے جانے سے لگایا جاسکتا ہے)، منگولوں نے لفظ اردو ترکی زبان سے مستعار لے لیا اور اسے محل کے معنوں میں برتنے لگے (خیال رہے کہ ترکی اور منگولیائی زبانوں کے التائی گروہ سے تعلق رکھتی ہیں اور ان میں آپسی رشتہ موجود ہے)۔ جدید منگولیائی لغات اب بھی اس لفظ کے معنی محل ہی بتاتی ہیں۔

منگولوں کا مقدس ترین مقام وہ جگہ ہے جہاں چنگیز خان کی باقیات محفوظ کی گئی تھیں۔ اسے 'اردوس' کہا جاتا ہے (اویون بیلگ، 1997)۔

لیکن چوں کہ منگول خانہ بہ دوش تھے اور اپنی زندگیوں کا بیش تر حصہ خیموں میں گزارا کرتے تھے، لفظ اردو خیمہ یا کیمپ کے معنی میں استعمال کیا جانے لگا۔

1235ء میں چنگیز خان کے جانشین اوغدائی خان نے باتو خان کی قیادت میں ایک لشکر یورپ کی سمت روانہ کیا۔ چند سالوں کے اندر اندر اس لشکر نے روس، پولینڈ اور ہنگری کو روند کے رکھ دیا۔ اس تمام مہم کے دوران ایک منقش طلائی خیمہ باتو خان کے زیرِ استعمال رہا، جس کی وجہ سے تمام لشکری خیمہ گاہ کو 'التون اردو' یا سنہرا کیمپ کہا جانے لگا۔ باتو خان نے 1242ء میں مشرقی یورپ میں منگول سلطنت کی داغ بیل ڈالی جو پندرھویں صدی تک قائم رہی۔ اسی اثنا میں لفظ اردو بھی یورپ کی زبانوں میں داخل ہونے لگا۔ اطالوی اور پرانی یوکرینی میں یہ 'اُردا' کے روپ میں ڈھلا، پولش اور ہسپانوی میں 'ہوردا' بن گیا، سوئس میں 'ہورد' کہلایا اور بالآخر مغرب کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے 1555ء میں انگریزی اور 1559ء میں 'ہورڈ' بن کر فرانسیسی میں داخل ہو

WWW.URDUFANZ.COM

گیا۔ رچرڈ ایڈن کی کتاب 'نئی دنیا کے عشرے' انگریزی زبان کی وہ کتاب ہے جس میں یہ لفظ پہلی بار استعمال ہوا ہے۔

اس قسم کے خیمے اب بھی منگولیا میں عام ہیں اور انہیں آج کل 'گر' کہا جاتا ہے۔ نیشنل جیوگرافک رسالے سے اقتباس:

کہیں نہ کہیں آپ کو ایک گول خیمہ نظر آجائے گا جسے منگول گر کہتے ہیں۔ ہم ایسے ہی ایک خیمے کے باہر رکے اور چائے کے لیے گرم پانی مانگا۔ گنگا نامی ایک عورت نے کمال مہمان نوازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کیتلی چولہے پر رکھ دی۔

میں نے اس سے پوچھا کہ آپ لوگ گھروں میں کیوں نہیں رہتے؟ "گھر کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہیں کیا جاسکتا۔" اس نے یوں جواب دیا جیسے اس سے بڑھ کر کسی اور بات کی اہمیت ہی نہ ہو۔ "آپ اسے یہاں سے وہاں، یا وہاں، یا وہاں نہیں لے جاسکتے،" وہ ہاتھوں سے اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ مجھے تو گنگا کا گھر اچھا خاصا پائدار معلوم ہوا۔ اس میں چارپائیاں تھیں، الماریاں تھیں، حتیٰ کہ دیواروں پر تصویریں تک ٹنگی ہوئی تھیں۔ لیکن اس نے بتایا کہ اس کا خاندان اپنے جانوروں کے لیے بہتر چراگاہوں کی کھوج میں اس سال تین بار نقل مکانی کر چکا ہے۔ ایک گر کو تہ کرنے میں صرف ایک گھنٹا لگتا ہے (مائیک ایڈورڈز، 1996)

جب منگول ایران میں آبسے تو لفظ اردو بھی ان کے ساتھ ہی چلا آیا۔ علاؤالدین عطا کی کتاب 'جہاں کشا' فارسی کی قدیم ترین کتاب ہے جس میں اس لفظ کو برتا گیا ہے (شیرانی، 1929ء)

WWW.URDUFANZ.COM

چلتا پھرتا شہر

ہر چند کہ ہندوستان میں لفظ اردو کے استعمال کی چند قبل از مغل دور مثالیں مل جاتی ہیں، لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ بعد میں اضافہ کیا گیا ہے (شیرانی 1928ء)۔ تاہم ظہیر الدین بابر کے وقت یقیناً لفظ اردو کا استعمال عام ہو چکا تھا، حتیٰ کہ خود بابر نے اسے اپنی تزک میں لکھا ہے۔ اکبر کے دور میں اس لفظ کے مرکبات عام استعمال کیے جاتے تھے، مثال کے طور پر 'اردوئے معلیٰ'، 'اردوئے علیا'، 'اردوئے بزرگ'، حتیٰ کہ 'اردوئے لشکر'۔ تمام مرکبات میں اردو کا مطلب شاہی کیمپ ہے (شیرانی، 1929ء)۔ اکبر کے درباری وقیہ عہ نویس ابوالفضل نے اپنی مشہور کتاب 'آئینِ اکبری' میں ایسی ہی ایک خیمہ گاہ 'اردوئے ظفر قریں' کا ذکر تفصیل سے کیا ہے:

شاہی خیمے اور حرم کے لیے ایک 1530 گز لمبا میدان منتخب کیا گیا۔ ان میں سب سے بڑا اور اہم خیمہ گلال باڑ ہے جو ایک قلعہ نما، تہ ہو جانے والا چوبی خیمہ ہے جس کی لمبائی اور چوڑائی سو سو گز ہے۔ اس کے جنوبی حصے میں دربار ہے جس کے ۴۵ حصے ہیں، ہر حصہ ۴۱ ضرب ۴۲ گز ہے۔ مرکز میں دو منزلہ چوبی شاہی محل ہے جہاں بادشاہ صبح عبادت کرتا ہے۔ بیگمات اس حصے میں بغیر اجازت داخل نہیں ہو سکتیں۔ اس سے ملحق 24 چوبی راوٹیاں (چوکور خیمے) ہیں، ہر ایک 10 ضرب ۶ گز ہے جہاں بیگمات رہائش پذیر ہوتی ہیں۔۔۔ وسط میں بڑا چوبی دربار ہے۔ ایک ہزار ملازم اسے نصب کرنے پر مامور ہیں۔ اس کے 72 دروازے ہیں اور اس میں دس ہزار لوگوں کی نشست کی گنجائش ہے۔ (شیرانی، 1929ء)

آپ نے دیکھا کہ خیمہ گاہ کیا ہے، چلتا پھرتا شہر ہے۔ جرمن مورخ فریڈرک آگسٹس نے بھی اپنی کتاب 'شہنشاہ اکبر' میں ایک خیمہ گاہ کا ذکر کیا ہے:

ایسے ہر خیمے کی ترسیل کے لیے 1000 ہاتھی، ۵۰۰ اونٹ، ۴۰۰ بیل گاڑیاں اور ۱۰۰ قلی استعمال کیے جاتے تھے۔ (آگسٹس 1885ء)

'اردوئے ظفر قریں' میں ایک سفری ٹکسال بھی تھی اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اسے بھی اردوئے ظفر قریں کہا جاتا تھا۔ یہ ٹکسال جہانگیر اور شاہجہاں کے وقت بھی زیرِ استعمال تھی اور بعد میں صرف اردو کہلانے لگی (شیرانی، 1929ء)۔ اس ٹکسال کے کئی سکے اب بھی پائے جاتے ہیں جن پر 'ضربِ اردوئے ظفر قریں' کندہ ہے۔ ان میں سے کچھ سکوں کی تصاویر انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہیں۔

WWW.URDUFANZ.COM

دلّی جو ایک شہر تھا

بابر کے جانشین دہلی کے کچھ زیادہ دل دادہ نہیں تھے اور اس پر آگرے یا لاہور کو ترجیح دیتے تھے۔ اکبر نے تو خیر کبھی دہلی کی سرزمین پر قدم ہی نہیں رکھا۔ تاہم فنِ تعمیر کے شوقین شاہجہان نے جب اپنے لیے ایک نیا شہر بسانا چاہا تو اس کے مہندسوں نے جو جگہ منتخب کی وہ دریائے جمنا کے کنارے دہلی شہر کے قریب واقع تھی۔ دس برس کی تعمیرات کے بعد 18 اپریل 1648ء کو ہندوستان کے نئے دارالسلطنت کا افتتاح ہوا اور اسے شاہجہان آباد کا نام دیا گیا۔ اس شہر کی چند اہم عمارات میں لال قلعہ، جامع مسجد، باغِ حیات بخش، امتیاز محل اور ایک دو منزلہ ڈھکا ہوا بازار شامل تھے (شاہجہان نامہ، 1660ء)۔

نئے شہر کے بسنے کے کچھ ہی عرصے بعد پہلے لال قلعے اور پھر پورے شاہجہان آباد کو 'اردوئے معلیٰ' اور بعض اوقات صرف 'اردو' کہا جانے لگا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ مغل بادشاہ اکثر سفر میں رہتے تھے اور اس لیے ان کی قیام گاہ اردوئے معلیٰ یعنی شاہی کیمپ کہلانے لگی تھی۔ قدیم ترکی زبان کا ذکر پہلے ہی گزر چکا ہے جس میں لفظ اردو "خاقان کی رہائش گاہ" کے معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ (دلچسپ بات یہ ہے کہ بھوٹان کی قومی زبان کا نام زونگ کھا' ہے، جس کا لفظی مطلب 'قلعے کی زبان' ہے۔)

عہد ساز ماہرِ لسانیات، شاعر اور اردو شاعری میں استادی شاگردی کے ادارے کے بانی خانِ آرزو اپنی لغت 'نوادرِ الفاظ' (1747 تا 1752ء) میں لفظ 'چھنیل' کے تحت لکھتے ہیں:

ہم جو ہند کے باسی ہیں اور 'اردوئے معلیٰ' میں رہتے ہیں، اس لفظ سے آشنا نہیں ہیں۔

خانِ آرزو اپنی ایک اور کتاب 'مثمر' (1752ء) میں رقم طراز ہیں:

WWW.URDUFANZ.COM

پس ثابت ہوا کہ 'اردو' کی زبان ہی معیاری زبان ہے۔ یہیں کی فارسی مستند ہے۔ ہر ملک کے مختلف شہروں کے شاعر مستند زبان میں شاعری کرتے ہیں، جیسے شروان کا خاقانی، گنجہ کا نظامی، غزنی کا سنائی اور دہلی کا خسرو۔ اور یہ زبان اردو کی زبان کے سوا کچھ اور نہیں۔

اس اقتباس سے دو باتیں واضح ہوئیں: اول یہ کہ لفظ 'اردو' زبان کے لیے نہیں بلکہ شاہجہان آباد شہر کے لیے استعمال ہوا ہے۔ دوم یہ کہ خانِ آرزو کہہ رہے ہیں کہ شاہجہان آباد (دہلی) کی زبان فارسی ہے۔ اور اس میں تعجب کی کوئی بات اس لیے نہیں کہ مغلوں کے دور میں فارسی ہندوستان کی سرکاری اور دفتری زبان تھی۔

ایک اور مثال دیکھئے جو انیسویں صدی کے آغاز سے لی گئی ہے۔ دریائے لطافت (1807ء) میں انشا اللہ خان انشا اور مرزا قتیل لکھتے ہیں:

مرشد آباد اور عظیم آباد کے باسی اپنے تئیں اہلِ زبان سمجھتے ہیں اور اپنے شہر کو 'اردو' گردانتے ہیں (فاروقی، 1999ء)

ظاہر ہے دریائے لطافت کے فاضل مصنفین اردو سے مراد شاہجہان آباد لے رہے ہیں نہ کہ زبان۔ زبان تو خیر ان دنوں ہندی کہلاتی تھی۔

WWW.URDUFANZ.COM

آیا نہیں ہے لفظ یہ ہندی زباں کے بیچ

پہلے ذکر آچکا ہے کہ اٹھارہویں صدی میں اردو زبان کو ہندی کہا جاتا تھا۔ دراصل اس زبان کے لیے ہندی یا ہندوی نام صدیوں سے استعمال ہوتا چلا آیا تھا۔ فارسی کے مشہور شاعر خواجہ مسعود سعد سلمان (1046ء تا 1121ء) جو لاہور کے باسی تھے، کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ہندوی زبان میں ایک دیوان چھوڑا ہے۔ اگرچہ اس دیوان کا ایک شعر بھی وقت کی دست برد سے محفوظ نہیں رہ سکا، ایسے شواہد ضرور پائے جاتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دیوان کا واقعی وجود تھا۔ امیر خسرو (1253ء تا 1325ء) نے اپنی معرکہ آرا کتاب 'غرۃ الکمال' (1294ء) کے دیباچے میں لکھا ہے کہ مسعود نے تین زبانوں میں دواوین چھوڑے ہیں، فارسی، عربی اور ہندوی (جمیل جالبی، 1984ء)۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ ممکن ہے اس 'ہندوی' سے مراد پنجابی ہو، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ امیر خسرو اس دور کے ہندوستان میں بولے جانی والی زبانوں میں فرق روا رکھتے ہیں اور پنجابی کو 'لاہوری' لکھتے ہیں۔

غرۃ الکمال ہی میں خسرو اپنی زبان کے بارے میں یوں سخن طراز ہیں:

من ترکِ ہندوستانیم، من ہندوی گویم چوں آب

(میں ہندوستانی ترک ہوں، میں ہندوی پانی کی طرح بولتا ہوں)

اپنی مثنوی 'نہ سپہر' میں خسرو نے دعویٰ کیا ہے کہ الفاظ کی شیرینی میں ہندوی فارسی اور ترکی دونوں سے بڑھ کر ہے۔ (سلیم اختر، 1995ء)

WWW.URDUFANZ.COM

اس وقت سے لے کر انیسویں صدی تک اردو زبان کو ہندی ہی کہا جاتا تھا۔ مختلف ادوار سے چند مثالیں پیشِ خدمت ہیں:

بہ کالا پانی فرود آمدم کہ بہ زبانِ ہندی مراد آبِ سیاہ است

جہانگیر، تزکِ جہانگیری، دورِ حکمرانی 1650ء تا 1672ء (جمیل جالبی، 1984ء)

میں ہندی زبان سوں لطافت اس چھنداں سوں نظم ہور نثر ملا کر گلہ نہیں بولیا

ملا وجہی، سب رس، 1653ء (سلیم اختر، 1995ء)

اگرچہ سبھی کوڑاو کرکٹ است

بہ ہندی ورندی زبان اٹ پٹ است

جعفر زٹلی، متوفی 1713ء (شوکت سبزواری، 1978ء)

تمام شد نکات الشعرائے ہندی

میر تقی میر، نکات الشعرا، 1759ء

کیا جانوں لوگ کہتے ہیں کس کو سکونِ قلب

آیا نہیں ہے لفظ یہ ہندی زبان کے بیچ

میر تقی میر

WWW.URDUFANZ.COM

وہ اردو کیا ہے، یہ ہندی زباں ہے

کہ جس کا قائل اب سارا جہاں ہے

مراد شاہ، نامۂ مراد، 1788ء (جمیل جالبی، 1984ء)

مصحفی فارسی کو طاق پہ رکھ

اب ہے اشعارِ ہندوی کا رواج

شیخ ہمدانی مصحفی

اول یہ کہ اس جگہ ترجمہ لفظ بہ لفظ ضروری نہیں کیوں کہ ہندی تراکیب عربی سے بہت بعید ہے۔

شاہ عبدالقادر، ترجمۂ قرآن، 1795ء

یہی نہیں بلکہ اردو کے لیے لفظ ہندی کا استعمال بیسیوں صدی میں بھی موجود ہے۔ اور وہ علامہ اقبال کے ہاں، جو اپنی فارسی شاعری کے دفاع میں فرماتے ہیں:

گرچہ ہندی در عذوبت شکر است

طرزِ گفتارِ دری شیریں تر است

(اگرچہ 'ہندی' ذائقے میں شکر ہے

فارسی کا طرزِ گفتار شیریں تر ہے)

علامہ اقبال، اسرارِ خودی، 1915ء (فاروقی، 1999ء)

WWW.URDUFANZ.COM

مثالوں کی لمبی فہرست کے لیے معذرت، لیکن ان سے ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ زبان جسے ہم آج اردو کے نام سے جانتے ہیں، انیسویں صدی میں اور اس سے پہلے ہندی کے نام سے جانی جاتی رہی ہے۔ اوپر دیے گئے مراد شاہ کے شعر میں پہلی بار لفظ اردو کو زبان کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ سال ہے 1788ء (واضح رہے کہ بعض محققین نے اس سے پیشتر کی بھی چند مثالیں ڈھونڈی ہیں، جیسے محمد مائل، 1776ء اور مصحفی، 1776ء لیکن ان دونوں مثالوں کی توقیت کے بارے میں شکوک و شبہات پائے جاتے ہیں، فاروقی، 1999)

لیکن لاہور کے باسی مراد شاہ کے مندرجہ بالا شعر کے وقت بھی اردو کا عام مطلب زبان نہیں تھا۔ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں کہ انشاو قتیل نے 1807ء میں اس اردو کو دہلی شہر کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ حتیٰ کہ 1846ء میں شائع ہونے والی جان شیکسپیئر کی مرتبہ لغت 'اے ڈکشنری آف ہندوستانی اینڈ انگلش' بھی لفظ اردو کے بطور زبان معنی سے واقف نہیں ہے، جہاں اس لفظ کے تحت لکھا ہے:

اردو: فوج، کیمپ، بازار

اردوئے معلیٰ: شاہی کیمپ یا لشکر۔ عام طور پر اس سے دہلی شہر یا شاہجہان آباد مراد لی جاتی ہے۔

اس موقعے پر اہم سوال یہ اٹھتا ہے کہ کب اور کیسے ہندی زبان کا نام اردو پڑا۔

WWW.URDUFANZ.COM

کلام الملوک

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، اٹھارہویں صدی میں اردو یا اردوئے معلیٰ کا مطلب دہلی شہر تھا۔ خانِ آرزو کا بیان بھی ہم پڑھ چکے ہیں کہ اردو کی زبان فارسی ہے۔ لیکن خانِ آرزو کے بھانجے میر تقی میر کو اس سے اختلاف تھا چناں چہ وہ اپنے تذکرے نکات الشعرا میں لکھتے ہیں کہ ہندی دراصل زبانِ اردوئے معلیٰ ہے۔ (فاروقی، 1999ء)

یقیناً فارسی مغلوں کے دور میں ہندوستان بھر کی سرکاری زبان تھی۔ لیکن اورنگ زیب کے انتقال (1707ء) کے بعد مغل قلمرو کا شیرازہ بکھرنا شروع ہو گیا تھا۔ اور اٹھارہویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے با جبروت مغل سلطنت عملاً اردوئے معلیٰ تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ مغل بادشاہ شاہِ عالم ثانی کے بارے میں ایک شعر اس صورت حال کی عکاسی کرتا ہے:

سلطنتِ شاہِ عالم

از دلی تا پالم

نظامِ حکومت کے تار و پود بکھرنے اور انتظامی ڈھانچے میں دراڑیں پڑنے سے مغلوں کو تو خیر بڑا نقصان ہوا لیکن اردو زبان کو یہ فائدہ ہوا شاہی زبان فارسی کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی اور عوام کی زبان، یعنی اردو نے اپنی جڑیں مضبوط کرنی شروع کر دیں۔ (فاروقی، 1999ء) چناں چہ رفتہ رفتہ فارسی کی بہ جائے اردو دارالحکومت اور دربار کی اہم ترین زبان کے روپ میں سامنے آنا شروع ہو گئی۔ اس کی سب سے بڑی مثال یہ کہ خود مغل شہنشاہ محمد شاہ رنگیلا (عرصۂ حکومت 1719ء تا 1747ء) اور عالمگیر ثانی (عرصۂ حکومت 1754ء تا 1759ء) اردو میں شاعری کرتے تھے۔ شاہ عالم ثانی (عرصۂ حکومت 1759ء تا 1806ء) ہفت زبان تھا اور اس نے نہ

WWW.URDUFANIZ.COM

صرف ہندی، پنجابی، فارسی اور برج بھاشا میں شاعری کی ہے بل کہ اس کی داستان 'عجائب القصص' شمالی ہندوستان میں اردو نثر کی اولین کتابوں میں سے ایک ہے۔ چنانچہ چند عشروں کے اندر اندر 'زبانِ اردوئے معلیٰ' بجائے فارسی کے اردو قرار پائی (جمیل جالبی، 1987ء؛ فاروقی، 1999ء)

اب سوال یہ ہے کہ آخر دارا لحکومت کی زبان پر اتنا اصرار کیوں؟ ہم نے دیکھا کہ خانِ آرزو کے بہ قول صرف دارا لحکومت کی زبان ہی فصیح کہلائی جا سکتی ہے۔ ایک عربی کہاوت ہے، 'کلام الملوک، ملوک الکلام'، مطلب یہ کہ بادشاہ کی زبان زبانوں کی بادشاہ ہوتی ہے۔ (کلام الملوک والی بات فقط مشرق تک محدود نہیں ہے بلکہ مغرب میں بھی یہی حال ہے۔ آج بھی انگریزی زبان کی سب سے مستند گرامر کی کتاب کا نام 'دی کنگز انگلش' ہے۔) اس کی وجہ یہ ہے کہ شاہی دربار محض انتظامی مرکز ہی نہیں بل کہ علوم و فنون کا گڑھ بھی ہوا کرتا تھا۔ شاہی سرپرستی کی آرزو میں نہ صرف ملک بھر بل کہ دوسرے ملکوں سے علما و فضلا کھنچے چلے آتے تھے۔ مغلوں کا سنہرا دور تو الگ رہا، ہم دیکھتے ہیں کہ محمد شاہ رنگیلا کے سے گئے گزرے زمانے میں بھی مشہور فارسی شاعر شیخ حزیں دہلی آ بسے تھے۔ غالب نے 'مہرِ نیم روز' میں رونا رویا ہے کہ شاہجہان کے درباری شاعر طالب آملی کو سونے میں تولا گیا تھا (حالی، 1894ء)۔ دارا شکوہ کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے ایک شعر پر خوش ہو کر شاعر کو ایک لاکھ روپے انعام دیا تھا (جمیل جالبی، 1987ء)۔ ظاہر ہے وہ شہر جہاں ایسے صاحبانِ علم و فن بستے ہوں، وہاں کی زبان کا مستند مانا جانا عین قرینِ قیاس ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ رفتہ رفتہ اردو فارسی کو ہٹا کر دہلی کی فصیح اور مستند زبان کے تخت پر براجمان ہو گئی اور لوگ اسے 'زبانِ اردوئے معلیٰ' کہنے لگے۔ ظاہر ہے کہ ترکیب لمبی تھی، اس لیے سکڑ کر 'اردوئے معلیٰ' اور آخر کار صرف 'اردو' بن گئی۔

اس طولِ کلام سے واضح ہوا کہ اردو زبان کے نام کا لشکر سے دور دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اور ظاہر ہے کہ زبان کا مغل فوج کی چھاؤنیوں میں جنم لینے والا قصہ تو گپ شپ کے قبیل میں آتا ہے۔ اردو کے زبردست نقاد اور

WWW.URDUFANZ.COM

محقق جناب شمس الرحمن فاروقی نے مجھے بتایا ہے فارسی زبان میں لفظ اردو کے بطورِ لشکر استعمال کی انیسویں صدی سے قبل ایک بھی مثال نہیں ملتی۔

اس موقعے پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ بحث کا خلاصہ پیش کر دیا جائے:

اردو زبان کا لشکر سے کوئی تعلق نہیں ہے

اس کا نام شاہجہان آباد (یعنی دہلی) سے نسبت کی وجہ سے پڑ گیا

زبان کو اردو اٹھارہویں صدی کے آخری چوتھائی حصے میں کہا جانے لگا۔

اس سے قبل اور اس دوران بھی اردو کا سب سے زیادہ مستعمل نام ہندی تھا۔

اب ہم جائزہ لیں گے کہ اگر اردو کو ہندی کہتے تھے تو پھر یہ آکاش وانی پر بولی جانے والی زبان کیا شے ہے؟

WWW.URDUFANZ.COM

دو نئے انداز

جب انگریز ہندوستان آئے تو انہیں یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ ہندو اور مسلمان ایک ہی زبان بولتے ہیں۔ ایک ایسی زبان جس کا ڈھانچہ اور صرف و نحو خالصتاً مقامی ہیں لیکن جس نے فارسی اور فارسی کے توسط سے عربی زبان سے اثر قبول کیا ہے اور جو عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ انگریزوں کی حیرت کی بنا یہ تھی کہ مسلمان اور ہندو ان کے تئیں دو مختلف قومیں تھے چناں چہ ان کی زبانیں بھی مختلف ہونی چاہیے تھیں۔ فورٹ ولیم کالج کے بانیوں میں سے ایک، جان گلکرسٹ کچھ یوں رقم طراز ہے:

’(ہندوستان) کے باسی ہندو اور مسلمان ہیں۔ ہم ان کے لیے اور ان کی زبان کے لیے بڑے آرام سے عمومی اور جامع اصطلاح ہندوستانی استعمال کر سکتے ہیں۔ جس کو میں نے مندرجہ بالا اور مندرجہ ذیل اسباب کی بنا پر اختیار کیا ہے:

اگرچہ اس ملک اور اس کی مذکورہ زبان (ہندوستانی) کا یہ نام نیا ہے، لیکن مجھے اس زبان کے مطالعے اور اسے پروان چڑھانے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور نام نہیں ملا۔ اس امر کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ مقامی لوگ اسے ہندوستان کے پرانے نام ہند کی نسبت سے ہندی کہتے ہیں، لیکن اس نام کے دوسرے ناموں، ہندوی، ہندووی وغیرہ سے خلط ملط ہونے کے امکانات ہیں جو ہندو سے مشتق ہیں۔ اس لیے میں اپنے نظریے پر قائم ہوں کہ اس ملک کی مقبولِ عام زبان کے دوسرے تمام نام، جن میں مور جیسا بے معنی نام بھی شامل ہے، ترک کر کے انہیں ہندوستانی سے بدل دینا چاہیے۔ چاہے مقامی اس کی پیروی کریں یا نہ کریں۔ وہ تو ویسے بھی سمجھانے کے باوجود ایسی باتوں کی مصلحت نہیں سمجھ سکتے۔‘

WWW.URDUFANZ.COM

یہاں قابلِ دید بات یہ ہے کہ مستشرقوں کے عام اندازِ فکر کے عین مطابق گلکرسٹ مقامیوں کی مادری زبان کے بارے میں ان کے نظریے کو قلم زد کر کے یک طرفہ ڈگری جاری کر دیتا ہے۔ دو ہی برس بعد گلکرسٹ ایک بار پھر بڑے پر تیقن لہجے میں لکھتا ہے:

'ہندو قدرتی طور پر ہندی کی طرف جھکیں گے جب کہ ظاہر ہے مسلمان عربی اور فارسی کی نسبت جانب دار ہوں گے۔ یوں دو نئے انداز جاری ہو جائیں گے۔'

اور دو نئے اندازوں کی نشوو نما کے لیے گلکرسٹ نے فورٹ ولیم کالج میں ملازمت اختیار کر لی۔ یہ کالج انگریزوں کو مقامی زبانیں سکھانے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ چوں کہ نصابی ضروریات کے لیے درکار سلیس اردو نثر کی کتابیں دستیاب نہیں تھیں اس لیے کالج نے کئی مصنفین کو ملازم رکھا تا کہ وہ نئی کتابیں لکھیں (کہا جاتا ہے کہ میر تقی میر نے بھی ملازمت کے لیے عرضی دی تھی لیکن ان کی درخواست اس بنا پر نامنظور کر دی گئی کہ یہ ملازمت ان کے مرتبے سے بہت کم تھی (ڈاکٹر گوہر نوشاہی، ذاتی گفتگو)۔ یہ کالج 1853ء تک کام کرتا رہا اور اس عرصے میں اس کے توسط سے کل ۱۴۷ کتابیں مرتب ہوئیں، جن میں سے 53 شائع ہوئیں (ڈاکٹر سمیع اللہ)۔

میر امن دہلوی نے اس کالج کے نصاب کے لیے 1802ء میں 'باغ و بہار' لکھی جو آج اردو نثر کے شاہکاروں میں شمار کی جاتی ہے۔ اسی کالج سے اردو کے مشہور ادیب حیدر بخش حیدری (آرائشِ محفل)، کاظم علی جوان (شکنتلا کا اردو ترجمہ) اور بابر علی حسینی وغیرہ وابستہ تھے۔

یہ تو ہو گئے اردو مصنفین (واضح رہے کہ انگریز اس زمانے میں اردو کو ہندوستانی کہنے پر مصر تھے)، لیکن فورٹ ولیم کالج نے ساتھ ہی ساتھ کچھ دیوناگری کے ماہرین کی خدمات بھی حاصل کر لیں اور ان سے 'جدید' ہندی میں کتابیں لکھوانے لگے۔ للولال جی جس نے 1803ء میں 'پریم ساگر' لکھ کر جدید ہندی ادب کی خشتِ اول

WWW.URDUFANZ.COM

رکھی، کے سامنے جدید ہندی کا کوئی نمونہ نہیں تھا۔ چناں چہ اس نے میر امن کی باغ و بہار سامنے رکھ کر عربی فارسی اسما کو سنسکرت اسما سے بدل دیا۔ رام چندر شکلا لکھتے ہیں:

اگر للو لال اردو کے ماہر نہ ہوتے تو وہ پریم ساگر میں عربی و فارسی الفاظ سے گریز میں کامیاب نہ ہو پاتے۔ اس دور کی روزمرہ زبان میں یہ الفاظ اس حد تک سرایت کر گئے تھے کہ محض سنسکرت یا ہندی کے ماہر کے لیے ان کی شناخت مشکل تھی۔ (ہندی ساہتیہ کا اتہاس)

فورٹ ولیم ہی کا تنخواہ دار ایک اور ماہرِ دیوناگری سدل متر تھا۔ وہ اپنی کارگزاری کچھ یوں بیان کرتا ہے:

گلکرسٹ نے۔۔۔ ایک دن آگیا دی کہ ادھیاتم رامائن کو ایسی بولی میں کرو جس میں فارسی، عربی نہ آوے۔ تب سے میں اس کو کھڑی بولی میں کرنے لگا۔

یہاں دلچسپ اور قابلِ غور بات لفظ 'کھڑی بولی' کا استعمال ہے۔ اس لفظ نے ماہرینِ لسانیات کو بڑے مغالطوں میں مبتلا کیا ہے۔ کسی نے کہا کہ چوں کہ اردو یا ہندی میں افعال کا اختتام الف پر ہوتا ہے (آنا، جانا، کھانا، وغیرہ) اس لیے اس کو کھڑی بولی کہتے ہیں، جب کہ اس کے مقابلے میں دوسری زبانیں 'پڑی بولی' ہیں۔ مثال کے طور پر برج بھاشا پڑی بولی ہے کیوں کہ اس میں آئیو، جائیو، کھائیو کہتے ہیں۔ معروف ماہرِ لسانیات ڈاکٹر سہیل بخاری تو بڑے دور کی کوڑی لائے اور انہوں نے مشرقی ہندوستان میں ریاست اڑیسہ کے قرب و جوار میں ایک علاقہ کھڑ دیس کے نام سے بھی دریافت کر ڈالا اور دعویٰ کیا کہ یہی کھڑی بولی، یعنی اردو کی مزربوم ہے۔

کھڑی بولی نام کی حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک جعلی اور مصنوعی نام ہے۔ اس کا سراغ 1798ء سے قبل نہیں ملتا۔ اس سال گلکرسٹ 'اورینٹل لنگوئسٹ' میں لکھتا ہے:

شکنتلا کا دوسرا ترجمہ کھڑی بولی یا ہندوستان کی خالص بولی (sterling tongue) میں ہے۔ ہندوستانی (یعنی اردو) سے مختلف یہ صرف اس بات میں ہے کہ عربی و فارسی کا لفظ چھانٹ لیا جاتا ہے۔

WWW.URDUFANZ.COM

میرا اندازہ ہے کہ گلکرسٹ یہاں 'کھری بولی' لکھنا چاہ رہا تھا لیکن کتابت کی غلطی یا کسی اور بنا پر لفظ کھری کو کھڑی مان لیا گیا۔ بعد میں فورٹ ولیم کالج کے مصنفین نے 'ہندوستان کی خالص بولی' کو کھڑی بولی کہنا شروع کر دیا اور یہ لفظ غلط العام و خواص ہو گیا۔

خیر ہندی اردو تنازعے کی طرف لوٹتے ہیں۔ ماہرِ لسانیات ایف ای کی اپنی کتاب 'تاریخِ ہندی ادب' میں لکھتا ہے:

ہندوؤں کے لیے ایک ایسی زبان حسبِ خواہ تھی جس سے وہ وابستگی محسوس کر سکیں۔ اور اس مقصد کے لیے اردو سے فارسی اور عربی کے الفاظ نکال کر ان کی جگہ سنسکرت کے الفاظ رکھ دیے گئے (ایف ای کی، 1920ء)۔

دوسرے ماہرینِ لسانیات بھی کی کے ہم نوا نظر آتے ہیں۔ عالمِ بشریات اور مشہور کتاب 'شاخِ زریں' کا مصنف ولیم فریزر 'ہندوستان کی ادبی تاریخ' میں لکھتا ہے:

اونچی ہندی ایک کتابی زبان تھی جو انگریزوں کے زیرِ اثر پروان چڑھی، جنہوں نے مقامی ادیبوں کو آمادہ کیا کہ وہ اردو سے فارسی اور عربی کے الفاظ نکال کر ان کی جگہ سنسکرت کے الفاظ رکھ دیں (ولیم فریزر، 1893ء)

ڈاکٹر تاراچند 'ہندوستانی کا مسئلہ' میں رقم طراز ہیں:

فورٹ ولیم کالج انگریزوں نے برطانوی افسروں کو مقامی زبانیں سکھانے کے لیے قائم کیا تھا۔ ان میں دو زبانیں برج اور اردو تھیں۔ برج شاعرانہ زبان تھی اور نثری تحریر کے لیے مناسب نہیں تھی۔ اردو تمام ہندوستان کی مشترکہ زبان تھی۔ بدقسمتی سے زبان میں تخصیصات تلاش کرنے کی دھن میں کالج کے پروفیسروں نے ایک نئی اردو تخلیق کرنے کی حوصلہ افزائی کرنا شروع کر دی جس میں عربی و فارسی الفاظ کو سنسکرت الفاظ سے بدل دیا گیا تھا۔ یہ کام بڑی ڈھٹائی سے ہوا تاکہ ہندوؤں کو ان کی اپنی زبان فراہم کی جا سکے۔ لیکن اس کے بڑے دور رس

WWW.URDUFANZ.COM

اثرات مرتب ہوئے اور ہندوستان آج تک زبانوں کی اس مصنوعی تقسیم کے اثرات سہہ رہا ہے (تارا چند، 1944ء)

جارج گریرسن جس نے ہندوستانی لسانیات کی سب سے اہم کتاب 'ہندوستان کا لسانی سروے' مرتب کی، 1896ء میں للولال کی کتاب کے دیباچے میں لکھتا ہے:

ہندوستان میں ایسی کوئی زبان پہلے سے موجود نہیں تھی۔ چناں چہ جب للولال نے پریم ساگر لکھی تو وہ دراصل ایک نئی زبان ایجاد کر رہا تھا۔

اور آخر میں سنیتی کمار چٹرجی کی سن لیجیے، جنہیں ہندوستانی لسانیات کا باوا آدم مانا جاتا ہے:

تاریخی اور لسانی اعتبار سے اردو ہندی یا سنسکرت آمیز کھڑی بولی کی اسلامی شکل نہیں ہے، حقیقت اس کے برعکس ہے۔ دراصل ہندوؤں نے فارسی آمیز ہندوستانی اختیار کر لی تھی جو دربار اور اس کے حلقوں میں استعمال ہونے لگی تھی۔ چوں کہ فارسی اور عربی الفاظ ان کے لیے بے کار تھے، اس لیے انہوں نے دیوناگری رسم الخط اختیار کر لیا اور فارسی اور عربی کے الفاظ خارج کر کے زبان کو سنسکرت آمیز بنا دیا۔ (چٹرجی، 1973ء)

اس موقعے پر سوال اٹھتا ہے کہ دونوں زبانوں کا ماخذ اردو سہی، لیکن کیا جدید اردو اور جدید ہندی دو مختلف زبانیں ہیں؟ اور جواب ہے، نہیں۔ لسانیات کا مانا ہوا اصول ہے کہ زبانوں کی تقسیم و تفریق اور درجہ بندی ان کے افعال کی بنا پر ہوتی ہے، نہ کہ اسما کی بنیاد پر۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زندہ زبانوں کے اسما بہت لچکدار ہوتے ہیں اور بڑی تیزی سے زبان کے ذخیرے میں داخل ہوتے اور نکلتے رہتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں افعال نسبتاً مستقل رہتے ہیں اور ان میں آسانی سے تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ لسانیات میں افعال کو زبان کی ریڑھ کی ہڈی تصور کیا جاتا ہے۔ اب دیکھتے ہیں کہ اگر جدید ہندی اور جدید اردو کو افعال کے حوالے سے پرکھا جائے تو کیا شکل سامنے آتی ہے۔

WWW.URDUFANZ.COM

ایک روسی ماہرِ لسانیات سٹیفنی سلاف مارٹنیک نے اسی تناظر میں جدید ہندی اور جدید اردو کے تقریباً ساڑھے چار لاکھ الفاظ لیے اور ان کی بسامد (فریکونسی) کا تجزیہ کیا۔ معلوم ہوا کہ دونوں زبانوں میں ایک سو سب سے زیادہ استعمال ہونے والے الفاظ میں سے ستر مشترک ہیں۔ دونوں زبانوں میں بیس سے زیادہ استعمال ہونے والے الفاظ درجِ ذیل ہیں:

اردو: کا، ہونا، میں، کرنا، نے، اور، سے، کو، جانا، پر، کہ، دینا، یہ، کہنا، وہ، کے لیے، نہیں، ایک، رہنا، جو،

ہندی: کا، ہونا، میں، نے، کرنا، کو، سے، جانا، کی، یہ، اور، وے، پر، کہنا، دینا، بھی، رہنا، نہیں، ایک، کے لیے

(‘ہندی اور اردو کی بحث کا شماریاتی جائزہ‘، ۲۰۰۲ء)

اور خیر، اب تو ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں اسما کے منبع کی بحث غیر متعلق ہوتی جا رہی ہے۔ اور وہ یوں کہ سرحد کے دونوں اطراف اسما، چاہے وہ فارسی و عربی کے ہوں یا سنسکرت کے، بڑی تیزی سے انگریزی الفاظ سے تبدیل کیے جا رہے ہیں۔

WWW.URDUFANZ.COM

گیان و گماں کی سرحد

عام خیال یہی ہے کہ اردو فارسی اور مقامی زبان (یا زبانوں) کے میل جول سے وجود میں آئی ہے۔ یہ بات اس لیے بالکل غلط ہے کہ اردو زبان کا ڈھانچا خالصتاً ہندوستانی ہے اور اس کا فارسی کا دور دور سے بھی کوئی واسطہ نہیں۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، زبانیں افعال اور صرف و نحو کی بنیاد پر جانچی جاتی ہیں، نہ کہ اسما کی بنا پر۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ اردو صرف و نحو پر فارسی اثر انداز نہیں ہوئی۔ اس کی ایک دل چسپ اور واضح مثال فارسی اضافت کی بحث ہے۔ بے شک ایک زمانہ گزرا ہے کہ بعض ادبا نے اردو اور فارسی الفاظ کے درمیان اضافت برتی ہے، مثال کے طور پر:

'وعدۂ' کل' مت کر اے ظالم کہ تجھ بن کل نہیں (شاہ حاتم)

یا پھر:

چاہو کہ پی کے پگ تلے اپنا وطن کرو

اول اپس کو عجز میں 'نقشِ چرن' کرو (ولی دکنی)

جدید دور میں اردو لسانیات کے تین بڑوں نے اردو اور فارسی الفاظ کے درمیان اضافت کو روا جانا ہے، میری مراد ہے، شمس الرحمن فاروقی، رشید حسن خاں اور مرحوم شان الحق حقی سے۔ حقی صاحب نے تو اس 'صنعت' میں کچھ غزلیں بھی کہی ہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

سج گئی اشکِ فراواں سے مری کشتِ حیات

کثرتِ اوس سے ہے طرفِ چمن آئینہ بند

یہ ہے گیان و گماں کی سرحد، کدھر ہے تیرا جھکاؤ اے دل

گیان ہے فکر و نظر کا پھندا، گماں میں آزادیاں ہیں کیا کیا

لیکن بات پھر قبولِ عام کی آ جاتی ہے۔ ان حلقوں کے اصرار کے باوجود اردو اور فارسی و عربی الفاظ کے درمیان اضافت کو کسی دور میں بھی قبولِ عام نہیں مل سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے زبانیں دوسری زبانوں سے اسما تو بڑی سہولت سے قبول کر لیتی ہیں، دوسری زبانوں کی گرامر کے اصول اتنی آسانی سے ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل نہیں ہوتے۔ اضافت کے ذریعے دو الفاظ کو منسلک کر دینا فارسی گرامر کا اصول ہے اور اردو نحو کو یہ بات گوارا نہیں کہ وہ دوسری زبان سے اصول بر آمد کرے۔

ایک مثال سے بات واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں: انگریزی کا قاعدہ ہے کہ الفاظ کی جمع بنانے کے لیے آخر میں حرف ایس لگا دیا جاتا ہے، جیسے کار سے کارز، روڈ سے روڈز، وغیرہ۔ اب ہم اردو بولتے وقت انگریزی الفاظ میں تو انگریزی جمع کا اصول بے تکلفی سے برت لیتے ہیں، جیسے اس فقرے میں، ' روڈز پر کارز کی بھرمار ہو گئی ہے۔' لیکن انگریزی جمع بنانے کا اصول کبھی بھی اردو الفاظ کی جمع بنانے کے لیے نہیں استعمال کرتے۔ ایسے الفاظ کی شکل ہی مضحکہ خیز ہے، یعنی سڑکز اور گاڑیز۔ وجہ وہی کہ اسما تو قبول ہو جاتے ہیں، گرامر ہضم نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی گرامر کا اصول اردو کو گوارا نہیں۔

گرامر کو ایک طرف رکھ بھی دیں، پچھلے ایک ہزار سال کے تسلط کے باوجود فارسی اردو زبان کے بنیادی اسما کو متاثر نہیں کر سکی۔ جیسے بنیادی رشتے (ماں، باپ، بیٹا، بیٹی، بھائی، بہن، نانا، دادا، ماموں، چچا، حتیٰ کہ ساس، سسر)، بنیادی ہندسے (ایک، دو، تین، چار، پانچ، دس، بیس، پچاس، سو)، اہم اعضا (ہاتھ، پاؤں، ناک، ٹانگ، کان، آنکھ، منھ)، وغیرہ اب بھی اردو کے اپنے الفاظ ہیں۔

WWW.URDUFANZ.COM

مزید بر آں، مارٹنیک کی تحقیق، جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے، کے مطابق تحریری اردو کے بیس سب سے عام استعمال ہونے والے الفاظ میں، جو اردو ذخیرۂ الفاظ کا اڑتیس فیصد بنتا ہے، ایک لفظ بھی فارسی یا عربی کا نہیں ہے۔

مذکورہ بالا دلائل اس بات کا ثبوت ہیں کہ اردو مسلمانوں کی ایجاد نہیں ہے، بل کہ یہ دہلی اور اس کے قرب و جوانب میں قطب الدین ایبک کے ورود (1193ء) سے پہلے ہی بولی جاتی تھی۔ اس زبان کو اس وقت کیا کہا جاتا تھا، اس کا ادبی سرمایہ کیا تھا، کوئی نہیں جانتا۔ لیکن ماہرینِ لسانیات نے کچھ دھندلا سا نقشہ ضرور مرتب کیا ہے۔

WWW.URDUFANZ.COM

پہلی زبانیں، بگڑی زبانیں

WWW.URDUFANZ.COM

برِ صغیر میں زبانوں کے ارتقا کا سادہ نقشہ کچھ یوں مرتب کیا جا سکتا ہے۔

منڈا زبانیں: ۵۰۰۰ ہزار تا ۳۰۰۰ قبل مسیح

قدیم دراوڑی زبانیں: ۳۰۰۰ تا ۱۵۰۰ قبل مسیح

انڈو آرین: قبل از ۱۵۰۰ قبل مسیح

ویدک سنسکرت / قدیم انڈو آرین: ۱۵۰۰ قبل از مسیح تا ۱۰۰۰ قبل مسیح

کلاسیکی سنسکرت / وسطی انڈو آرین: ۱۰۰۰ ق م تا ۵۰۰ ق م

پراکرتیں: ۱۵۰۰ ق م تا ۵۰ ق م

اپ بھرنشیں: ۵۰۰ ق م تا ۱۰۰۰ ق م

جدید زبانیں: ۱۰۰۰ تا حال

(ماخوذ از گیان چند جین، 1994ء؛ عین الحق فرید کوٹی، 1972ء)

پراکرتیں وہ زبانیں تھیں جو آریاؤں کی آمد سے قبل ہندوستان میں بولی جاتی تھیں (پرا: پہلے؛ کرت: بنائی ہوئی۔ اس کے مقابلے میں سنسکرت کا مطلب ہے، خالص زبان)۔ ہم جانتے ہیں کہ آریاؤں کی آمد سے قبل بھی برِ صغیر گنجان آباد خطہ اور متنوع تہذیبوں کا گہوارہ تھا۔ امری نل تہذیب سات ہزار سال پرانی ہے جب کہ وادیِ سندھ کی عظیم الشان تہذیب آج سے پانچ ہزار پہلے اپنے عروج پر تھی۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ سب قومیں مختلف زبانیں

بولتی تھیں، جو صدیوں کے سفر میں اپنی شکلیں بدلتی چلی گئیں۔ انہی زبانوں کو پراکرتیں کہا جاتا ہے۔ پالی ان میں سے ایک پراکرت ہے جسے گوتم بدھ نے اپنی تعلیمات کی تشہیر کے لیے منتخب کیا۔

اپ بھرنشیں (لفظی مطلب، بگڑی زبانیں) کچھ اور بل کہ پراکرتوں کی ارتقائی شکلیں ہیں۔ بگڑی ہوئی زبانیں انہیں برہمنوں نے کہا جو سنسکرت کو خالص زبان سمجھتے تھے اور جنہیں اس کے بے داغ دامن پر تغیر کی ہلکی سی دھول بھی گوارا نہیں تھی۔ چناں چہ ہوا کیا کہ سنسکرت تو عجائب گھر میں رکھی ہوئی حنوط شدہ ممی بن گئی لیکن زندہ زبانوں کا سفر جاری و ساری رہا اور یہ دوسری زبانوں سے اثر قبول کرتی، اثر ڈالتی، سکڑتی پھیلتی، چھلتی چھلاتی آگے بڑھتی رہیں۔ ماہرینِ لسانیات کا خیال ہے کہ موجودہ زبانیں یکایک وجود میں نہیں آئیں بلکہ قدیم زبانوں کی بدلی ہوئی شکلیں ہیں۔ دراصل زبانیں زمانی اور مکانی دونوں اعتبار سے مسلسل عملِ تغیر سے دوچار ہوتی رہتی ہیں۔ جیسے ہر دس بارہ میل کے بعد ایک ہی زبان میں معمولی سا فرق آجاتا ہے، بالکل ویسے ہی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بھی زبانیں دھیرے دھیرے تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ جس طرح کسی علاقے میں زمین پر خط لگا کر نہیں کہا جاسکتا کہ یہاں سے فلاں لہجہ شروع ہوتا ہے، اتنا ہی مشکل زبان میں کسی تبدیلی کے صحیح سن کا تعین بھی ہے۔

ان نکات کو ذہن میں رکھتے ہوئے محققین نے بڑی دقت نظری سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جدید پنجابی جس اپ بھرنش سے نکلی ہے اسے پشاچی اپ بھرنش کہا جاتا ہے جب کہ برج بھاشا شورسینی اپ بھرنش کی ارتقائی شکل ہے۔ اردو زبان کی اپ بھرنش کون سی ہے، اس سلسلے میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے اور تاحال ماہرینِ لسانیات کسی سب کے لیے قابلِ قبول نتیجے تک نہیں پہنچ پائے۔ (گیان چند جین، 1984ء؛ شوکت سبزواری، 1987ء)

WWW.URDUFANZ.COM

چڑیا لائی چاول کا دانہ

یہ بحث ہمیں 1193ء میں لے جاتی ہے جب سلاطینِ غلاماں دہلی میں اپنی قلمرو کی داغ بیل ڈال رہے تھے۔ مذکورہ بالا، تا حال نامعلوم اردو زبان کی 'ماں' اپ بھرنش اس وقت دہلی اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی۔ جب مسلمان دہلی میں آباد ہو گئے تو ظاہر ہے کہ مقامی آبادی، جو غالب اکثریت میں تھی، کے ساتھ بول چال کے لیے انہیں مقامی زبان سیکھنا پڑی۔ سات صدیوں بعد تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا جب انگریز ہندوستان میں آبسے اور انہیں مقامیوں کی زبان سیکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مسلمانوں نے تو خیر اس مقصد کے لیے کوئی فورٹ ولیم کالج نہیں قائم کیا تا ہم جیسا کہ امیر خسرو کی گواہی سے معلوم ہوتا ہے، وہ جلد ہی مقامی زبان پانی کی طرح بولنے لگے۔ اور جیسا انیسویں صدی میں ہوا کہ شاہ کی زبان (انگریزی) کے الفاظ مقامی زبان (اردو) میں استعمال ہونے لگے، ویسا ہی بارہویں اور تیرہویں صدی میں بھی ہوا کہ فارسی کے اسما کا اثر مقامی زبان (اردو) پر ہوا۔ بالکل ایسے ہی جیسے انیسویں صدی میں اردو اور انگریزی کے میل جول سے کسی نئی زبان نے جنم نہیں لیا، بارہویں صدی میں بھی فارسی اور مقامی زبان کے اختلاط سے کوئی نئی زبان وجود میں نہیں آئی۔

ان صاحبان کی خدمت میں جو یہ سمجھتے ہیں کہ اردو مسلمانوں اور مقامیوں کی زبانوں کے خلط ملط ہونے سے ظہور میں آئی ہے، ایک سوال پیش کیا جا سکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ کیا وجہ ہے کہ اس مبینہ تال میل سے صرف ایک ہی زبان، یعنی اردو وجود میں آئی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں بھی نئی زبانیں کھمبیوں کی طرح اگ آتیں، کیوں کہ مسلمان صرف دہلی تک محدود نہیں رہے، وہ اس سے پہلے چار صدیاں قبل سندھ میں ڈیرے ڈال چکے تھے۔ پنجاب پر حکومت کرتے کرتے بھی انہیں ڈیڑھ صدی سے زائد کا عرصہ بیت چکا تھا۔

WWW.URDUFANZ.COM

بعد میں وہ بنگال، دکن اور ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل گئے۔ حتیٰ کہ پاکستان کے صوبۂ سرحد میں بھی کسی نئی زبان کے آثار نہیں ملتے حالانکہ وہاں کی تو کل آبادی اجتماعی طور پر مشرف بہ اسلام ہو گئی تھی۔

یہ نظریہ مشرق و مغرب کے کئی ماہرینِ لسانیات رد کر چکے ہیں کہ اردو زبانوں کے اختلاط سے بنی ہے، لیکن شاید سب سے رنگارنگ تردید جناب شوکت سبزواری کی طرف سے آئی ہے، فرماتے ہیں:

ایک نظریہ جسے میں غیر سنجیدہ سمجھتا ہوں، یہ ہے کہ اردو کھچڑی ہے: چڑیا لائی چاول کا دانہ، چڑا لایا دال کا دانہ، دونوں نے مل کر کھچڑی بنائی۔

حقیقت یہ ہے کہ زندہ زبانیں دوسری زبانوں سے الفاظ مستعار لیتی رہتی ہیں۔ انگریزی کی مثال سامنے کی ہے، اس نے دنیا بھر کی زبانوں، بشمول اردو، سے الفاظ اخذ کیے ہیں۔ لیکن انگریزی کو کوئی بھی مخلوط زبان نہیں کہتا۔ ہندوستان میں آیئے تو کئی دوسری زبانوں نے فارسی کے الفاظ اپنائے ہیں۔ پنجابی زبان کی مثال لے لیجیے، اسے بھی عام طور پر کھچڑی نہیں کہا جاتا۔ لیکن جدید پنجابی اور مسلمانوں کے بولنے والی پنجابی تو خیر الگ رہی، سولہویں صدی کے اوائل میں اس زبان میں لکھی گئی سکھوں کی مقدس کتاب گرو گرنتھ 'صاحب' تک میں فارسی و عربی کے ۳۴۳۱ منفرد الفاظ پائے جاتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

نانک دنیا کیسی ہوئی سالک مت نہ رہیو کوئی

بھائی باندھی ہیت چکایا دنیا کارن دین گنوایا

دل درد وائی جو کرے، درویشی دل راس عشق، محبت، نانکا، لیکھتا کرتے پاس

(جمیل جالبی، 1983ء)

WWW.URDUFANZ.COM

یہ سوال اکثر پوچھا گیا ہے کہ انیسویں صدی سے قبل ہندو کون سی زبان بولتے تھے۔ اس کا جواب پہلے ہی سنیتی کمار چٹرجی دے چکے ہیں۔ یعنی وہی زبان جسے آج اردو کہا جاتا ہے۔ نقطہ یہ ہے کہ مسلمان یہ زبان اپنے ساتھ ایران یا توران سے تو لائے نہیں تھے۔ یہ زبان انہوں نے یہیں پر مقامیوں سے سیکھی۔ اس لیے اسے مسلم زبان کہنا بالکل غلط ہے۔

جہاں تک رسم الخط کی بات ہے تو ناگری رسم الخط کے علاوہ کیتھی بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ تاہم سب سے زیادہ مستعمل لپی ترمیم شدہ فارسی ہی تھی۔ وجہ وہی کہ یہ سرکاری رسم الخط تھا اور ہندوستان بھر کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ اس حد تک کہ جنوب میں مرہٹوں اور شمال مغرب میں سکھوں کی ریاستوں کی درباری زبان بھی فارسی ہی تھی۔ بیسویں صدی میں پہلی بار عدالتوں میں اردو کے ساتھ ساتھ ناگری رسم الخط کو جگہ ملی۔ یہ الگ بات ہے کہ حکم نامے کے اصل الفاظ "ناگری اور فارسی رسم الخط" کو بعد میں حکومتِ ہند نے بدل کر "ہندی اور اردو زبانیں" کر ڈالا (آلوک رائے، 1995ء)۔

اٹھارہویں اور انیسویں صدیوں میں ہزاروں ہندو اُردو میں لکھتے تھے۔ لیکن جوں جوں ہندی اور اردو کے درمیان خلیج وسیع تر ہونے لگی، اردو ادبا اور مورخین نے ہندو ادیبوں کو اردو کے دائرۂ استناد سے خارج کرنا شروع کر دیا۔ مثال کے طور پر اردو ادب کی انتہائی با اثر 'آبِ حیات' میں صرف ایک ہندو شاعر دیا شنکر نسیم کا ذکر ہے اور وہ بھی محض حاشیے پر۔ دوسری طرف ہندی میں بھی یہی کچھ ہو رہا تھا، چنانچہ رام چندر شکلا کی کتاب 'ہندی ساہتیہ کا اتہاس' میں اٹھارہویں صدی کے اردو شعرا کا تذکرہ نہیں ہے، اس بات سے قطعِ نظر کہ وہ خود اپنی زبان کو ہندی کہتے تھے۔

فی الوقت تو صورتِ حال یہ ہے کہ اردو اور ہندی کے درمیان سیاسی اور مذہبی نزاع کی خلیج اتنی گہری ہو چکی ہے کہ اسے پاٹنے کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا۔ منشی پریم چند کے پوتے آلوک رائے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

WWW.URDUFANZ.COM

”قابلِ غور بات یہ ہے کہ دونوں فریق اس حقیقت سے آنکھ چرا رہے ہیں جس سے دونوں بہ خوبی واقف ہیں۔۔۔اور دونوں کو جاننے کی ضرورت ہے۔۔۔اور وہ حقیقت یہ ہے کہ عوام نے صدیوں کے عمل میں ایک خو ب صورت اور مشترک زبان تخلیق کی تھی۔بات یہ ہے کہ اگر مسئلے کی جڑ پر ایک زبان نہ ہوتی تو یہ معاملہ کبھی بھی اتنا طول نہ پکڑ تا۔“

تو یہ تھی اردو کی کہانی۔یہ غالباً دنیا کی واحد زبان ہے جو اول تا آخر بد گمانیوں، استعماری سازشوں، ریشہ دوانیوں اور شکوک و شبہات کی زد میں رہی ہے۔اس کا آغاز نزاعی، اس کا ارتقا غلط فہمیوں کی دھند میں لپٹا ہوا مذہبی ،علاقائی اور قومی تعصبات سے آلودہ اور اس کا رسم الخط متنازعہ ہے۔باقی باتیں تو الگ رہیں، اس کے نام ہی کے بارے میں یاروں نے طرح طرح کے افسانے اڑائے ہیں، جن میں سے کچھ کا ذکر پچھلے صفحات پر آ چکا ہے۔

جناب شان الحق حقی مرحوم کہا کرتے تھے کہ اردو زبان کی ہمہ گیری، وسعت اور مٹھاس کا کیا کہنا، یہ وہ زبان ہے جس نے دنیا کی تین عظیم زبانوں کا دودھ پیا ہے، سنسکرت، عربی اور فارسی۔غالباً اسی دودھ نے اردو میں وہ قوتِ مدافعت بھی پیدا کر دی ہے کہ مندرجہ بالا تمام اڑچنوں کے باوجود اس زبان کا ارتقا قابلِ رشک اور اس کا مستقبل تابناک دنیا میں کوئی اور زبان ایسی ہو تو بتایئے۔

***

ترتیب وڈیزائننگ۔۔۔۔۔ایم پی خان

اردو فینز ڈاٹ کام

WWW.URDUFANZ.COM